

مسلم سنی کتاب

از: عبد العلیم اصلاحي

مکتبہ الاقصیٰ سعید آباد، حمید آباد

قیمت 10/-

سیاست کی ضرورت

سیاست کتنی ضروری چیز ہے اور اسکی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھئے کہ جو گروہ بھی سیاست سے کنارہ کش ہے گا وہ بیل اور گھوڑے کے مانند ہوگا۔ بیل اور گھوڑے کا کام اپنے مالک کی گاڑی کھینچنا ہوتا ہے اور مالک صبح و شام جو چارہ دے وہ خاموشی سے کھانے۔ اسی طرح سیاست سے کنارہ کش رہنے والے لوگ غالب حکمرانوں کی مرضی کے تابع بن کر رہیں گے۔ ان کی مرضی اور پسند کا ملکی اور قومی امور میں کوئی دخل نہ ہوگا حتیٰ کہ انہیں اپنے ذاتی معاملات میں بھی بڑی حد تک حکمران طبقہ کی مرضی کا خیال کرنا ہوگا اس لئے کوئی ایسا گروہ جو زندگی اور کائنات کے بارے میں اپنا مخصوص عقیدہ اور نظریہ رکھتا ہو، اور اس عقیدہ کے تحت پوری زندگی کا مکمل نقشہ اور نظام رکھتا ہو وہ سیاست سے کیونکر کنارہ کش رہ سکتا ہے اور اگر سیاست سے بے تعلق ہو یا ایسی سیاست کے نہر میں غوطہ لگا رہا ہو جو اسکے اپنے عقیدہ اور نظریہ کے مخالف چشمے سے نکلی ہو تو ان دونوں صورتوں میں وہ گویا اپنے عقیدے اور نظریہ کے درخت پر خود کھڑی چلا رہا ہے۔ اور اپنی عزت اور خود داری سے ہمیشہ کے لئے دامن جھار چکنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ ہندوستان میں مسلم قوم کا یہی حال ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب انہوں نے ایک بزرگ کے زیر

صدارت یہ فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کی علحدہ سے کوئی سیاسی تنظیم بنانی
 نہ صحیح ہے نہ مفید تو اسی وقت گویا یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مسلمان اس
 ملک میں ہمیشہ کے لئے غیروں کے تابع بن کر رہیں گے اور وہ
 بحیثیت ایک گروہ یا ایک قوم اور ملت کبھی بھی عزت کے مقام پر
 نہیں بیٹھیں گے۔ ان کا عقیدہ توحید شرک اور الحاد کے ماتحت رہے گا
 ان کی تہذیب دیومالائی تہذیب کے مقابلہ میں مغلوب ہوگی۔ ان کی
 زبان کسمپرسی کی حالت میں ہوگی اور ان کا اپنا تشخص مشرکانہ طور طریقہ
 کی زد میں ہوگا۔ چنانچہ ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ
 ان کا عقیدہ، ان کا دین حتیٰ کہ ان کا پرسنل لا ان کی کتاب، ان کی تہذیب
 اور زبان ان کی عبادت گاہیں غیروں کے ہمہ جہتی حملوں کی زد میں ہیں
 اور ان کا کام مدافعتانہ طور پر التجاء گزارش اور مطالبہ کرنے کے سوا کچھ
 نہیں رہا یہ جو کچھ ہوا وہ بالکل فطری اور منطقی نتیجہ کے طور پر ہوا کیوں کہ
 جب انھوں نے اپنے دماغ سے ملی حیثیت میں اقتدار کی کرسی پر
 بیٹھنے کی سوچ ہی نکال دی، اور یہ سمجھ لیا کہ اب اس ملک میں ہم
 اقتدار کے منصب پر فائز ہی نہیں ہو سکتے۔ تو کیا ہوگا۔ انسان جب کوئی
 بات سوچ تک نہیں سکتا تو اس کے کرنے کا کیا سوال ہے۔ جب کوئی
 فوج شکست خوردہ ہو جائے۔ اس کے حوصلے پست ہو جائیں تو وہ کیا
 میدان میں اترے گی۔ اور کیا میدان مارے گی۔ اسکی مکمل تصویر اگر
 دیکھنی ہو تو ہماری پچھلی پچاس سالہ تاریخ کو کوئی دیکھ لے۔ ہم میدان
 سیاست میں اگر اترے تو دوسروں کے دست نگر اور محتاج بن کر،

غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے ہونے سائل اور ایسے بھکاریوں کے روپ میں آنے۔ جن کو ہر در سے نامراد واپس کیا گیا۔

ایک دوسرے رخ سے غور کیجئے

اسلام ہمارے عقیدہ کے مطابق ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں کیلئے ہدایات اور بنیادی اصول اس کے اندر موجود ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے مختلف وجوہ سے مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی طبقہ سیاست میں پڑنے کو دینداری کے خلاف سمجھتا ہے۔ دوسری بد قسمتی یہ ہے کہ جو لوگ سیاست کے میدان میں آتے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس اصول کو مانتے ہیں کہ سیاست میں دین اور مذہب کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے زندگی کو کئی خانوں میں اس طور پر تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے کہ یہ مذہبی حصہ ہے۔ اور یہ سیاسی، بلکہ زندگی کو مکمل طریقہ سے مذہبی اور دینی ہونا چاہئے کسی بھی شعبہ کو الگ کرنا ایک غیر دینی عمل ہوگا۔ جس چیز سے مسلمان کی آخرت بننے والی ہے اسی سے دنیا بھی بنے گی دنیا و آخرت دونوں جہاں کی کامیابی کی منزل تک پہنچنا ایک ہی راستہ سے ممکن ہے۔ دنیا کیلئے الگ راستہ اور آخرت کے کیلئے الگ راستہ اپنانا دینی نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ اس اصول کے تحت نقشہ کار بناتے ہیں انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی دنیا بھی بگڑے گی اور آخرت کے بگڑنے کا بھی سخت اندیشہ ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”دنیا آخرت کی کھیتی ہے الدنیا مزرعة الاخرة“

اس روشنی میں جب آپ سیاست کے موضوع پر سوچیں گے تو
 خود بخود یہ بات لازم ہو جائیگی کہ ہمارا سیاسی فارمولہ لازماً ایسا ہونا چاہئے
 کہ جو اسلامی اصولوں کے تحت ہو اور جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اخروی
 کامیابی بھی حاصل کر سکیں۔ اور دنیا میں بھی بامراد ہوں۔ اللہ اور اس
 کے رسول کی تعلیمات سے ہٹ کر سیاسی حکمت عملی اختیار کریں گے تو
 آخرت میں خسارہ سے دوچار ہونگے۔ اور دنیا بھی بگڑے گی۔ اس لحاظ
 سے بحیثیت مسلمان ہم مجبور ہیں کہ ہم جو بھی سیاسی نقشہ کار بنائیں
 اس کا ماخذ کتاب و سنت میں موجود ہو۔ اس مقام پر ملت اسلامیہ کی
 تیسری بد قسمتی یہ سامنے آتی ہے کہ مسلمان دانشور حتیٰ کہ علماء بھی
 جب سیاسی موضوع پر سوچتے ہیں یا گفتگو کرتے ہیں تو دینی سرچشموں
 سے روشنی حاصل کرنے کے بجائے کفار و مشرکین، مذہب بیزار اور
 مادہ پرست لیڈروں اور سیاست دانوں کے افکار و نظریات کے گورکھ
 دھندوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ کتاب الہی اور اسوۂ نبوی کی روشنی
 میں دنیا کے سامنے کوئی نقشہ کار پیش کرنا تو دور کی بات ہے خود اپنے
 لیے بھی زمانے سے ہٹ کر کوئی لائحہ عمل متعین نہیں کر پاتے۔
 بہر صورت سیاسی موضوع پر سوچتے وقت پہلا سوال یہ آنا چاہیے کہ
 سیاسی اعتبار سے وہ کیا مقصد ہے جسے ہمیں حاصل کرنا ہے۔ اور وہ
 کونسی منزل ہے جس تک ملت اسلامیہ کو پہنچنا ہے۔ اس سوال کا
 جواب شریعت کی روشنی میں سامنے آنا چاہیے۔ مگر اس رخ پر سوچا
 نہیں گیا۔ چنانچہ اس سوال کا جواب ہماری موجودہ سیاسی سرگرمیوں کو

دیکھنے سے یہ ملتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں کسی نہ کسی طرح وہ حقوق حاصل کر سکیں جو انہیں دستور ہند نے دیے ہیں۔ گویا مسلمانوں کی ساری سیاسی سرگرمیوں کا محور حقوق طلبی اور دستور ہند کے چوکھٹے میں رہ کر ترقیوں کی منزلیں طے کرنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے چار فارمولوں کو گزشتہ پچاس سالوں میں اپنایا گیا ہے۔ اگرچہ تقسیم کے فوراً بعد مولانا آزاد نے لکھنؤ میں ایک کانفرنس کر کے طے کر دیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علحدہ سے کوئی سیاسی تنظیم بنانا، نہ صحیح ہے اور نہ مفید۔ اس کے باوجود کئی گوشوں سے مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم بنائی گئی ہے۔ اگرچہ یہ راہ اپنانے والے بھی فرقہ پرستی کے الزام سے بچنے اور اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کے لئے برائے نام اپنا دروازہ غیر مسلموں کے لئے کھولنے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ اس زمرے میں مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد مجلس بچاؤ تحریک حیدرآباد۔ مسلم مجلس لکھنؤ اور مسلم لیگ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا فارمولہ جو بنایا گیا وہ یہ تھا کہ مسلمان انفرادی طور سے جس سیاسی پارٹی میں چاہیں شریک ہوں اور مسلم مفاد کے لئے کام کریں۔ چنانچہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کو ہم تین زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے مذہب بیزار مثلاً کمیونسٹ پارٹی۔ دوسرے نام نہاد سیکولر پائیاں جو ایک سے زائد تعداد میں موجود ہیں۔ تیسرے ہندو احمیاء پرست پارٹی مثلاً بھاجپا۔ آپ دیکھنے کہ ان تینوں قسم کی پارٹیوں میں مسلمان کسی نہ کسی مقدار میں اور کسی نہ کسی کیفیت کے ساتھ شریک

ہیں اور ان کی بھرپور معاونت کرتے ہیں۔ اس طرح مجموعی لحاظ سے مسلمانوں کی اکثریت بہر صورت سیاسی عمل سے وابستہ رہی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ملک کی دوسری اکائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی چیخ پکار الیکشن کے موقع پر زیادہ سنائی دیتی ہے۔ اس کا اندازہ مسلم علانوں میں جلسے جلوسوں اور ووٹنگ کے وقت برقع پوش خواتین کی قطاروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک چوتھا فارمولہ جس کا چرچا عموماً کیا جاتا ہے اور بعض حلقوں نے عملی طور سے بھی اپنانے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان دوسرے اقلیتی اور پس ماندہ طبقوں سے مل کر اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کریں۔

ان چار فارمولوں کے علاوہ کوئی نیا فارمولہ اس وقت مسلمانوں کے سامنے نہیں ہے۔ اس لئے گھوم پھر کر انہیں چار فارمولوں میں سے کسی ایک کو مختلف لوگ اپنا رہے ہیں۔ اس کی واضح مثال وہ فیصلہ ہے جو ملک کی پانچ مذہبی جماعتوں نے کیا ہے اور ایک مسلم ایجنڈہ مرتب کر کے قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے اس مسلم ایجنڈہ پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

”مشاورتی گروپ کے کنوینر مسٹر سیف الدین سوز نے کہا ہے کہ مسلم ایجنڈا تفصیلی صلاح و مشورے کے بعد تیار کیا گیا ہے۔ یہ ایجنڈا ملک کے اس دوسرے سب سے بڑے مذہبی گروپ کی جائز امنگوں کی نمائندگی کرتا ہے جس نے ہمیشہ سیکولر نظام میں یقین رکھا ہے۔ لیکن جس کی سیاسی مایوسی کو سیکولر مخالف طاقتیں غلط طور پر

استعمال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مسٹر سوز کے مطابق اس سیاسی مایوسی کی زیادہ تر وجہ مقننہ اور اقتدار کے ڈھانچے، سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں کم نمائندگی ہے۔ مسلم اقلیت کو حکومت اور ایڈمنسٹریشن میں ناکافی نمائندگی دی جا رہی ہے اور ترقیاتی اور فلاحی فنڈز کی تقسیم میں اس کے ساتھ امتیاز کیا جا رہا ہے۔ مسٹر سیف الدین سوز نے مزید کہا کہ سیکولر طاقتوں میں افراتفری سے بھی مسلمانوں میں احساس مایوسی پیدا ہوا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ سیکولر پارٹیوں کے درمیان مکمل مفاہمت پیدا ہوتا کہ فرقہ واریت کے سیلاب اور فرقہ پرست پارٹیوں کے پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔ انہوں نے کہا کہ اس مسلم ایجنڈے کے اجرا کے بعد مسلم تنظیموں کے سربراہ یا نمائندے سیکولر سیاسی پارٹیوں لیڈروں سے جلد از جلد ملاقاتیں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان سیکولر سیاسی پارٹیوں سے مسلم ایجنڈے پر ہمدردانہ غور کرنے اور اس ایجنڈے کو ان کے انتخابی منشور میں شامل کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ مسلم تنظیمیں ان سیاسی پارٹیوں پر اس بات کے لئے بھی زور دیں گی کہ وہ متحد ہو جائیں اور رد و بدل یا مفاہمت کے ذریعہ انتخابات میں فرقہ پرست پارٹیوں سے سیدھا مقابلہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سیاسی پارٹیوں سے یہ درخواست بھی کی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کی نمائندگی میں اضافہ کریں اور جہاں تک ممکن ہو سکے تقریباً ایک سو سے زیادہ مسلم آبادی والے پارلیمانی حلقوں میں صرف ایک مشترکہ مسلم امیدوار نامزد کریں۔ ایک

پریس نوٹ کے مطابق اس مسلم ایجنڈے میں اقلیتی تعلیم کی ایک کل ہند کونسل تشکیل دینے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے جس کو قانونی درجہ حاصل ہوگا۔ تمام سرکاری ملازمتوں کی تمام سطحوں پر مسلمانوں کے لئے ریزرویشن، اردو اور دوسری تمام اقلیتی زبانوں کو ان ریاستوں میں جہاں ان کی آبادی دس فیصد ہے۔ دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینا، مسلم پرسنل لا میں عدم مداخلت کی یقین دہانی کرانا، بابری مسجد کے مقام کو مسجد کی دوبارہ تعمیر کے لئے مسلمانوں کے حوالے کرنا، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی عبادت گاہوں کی حیثیت برقرار رکھنے کے قانون مجریہ ۱۹۹۱ء پر فوری عمل، مسلم ایجنڈے میں شامل دوسرے نکات ہیں، اس ایجنڈے کے دیگر اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

مسلم فرقہ کو شدت پسند قوم پرست عناصر کے دباؤ اور اس کو بدنام کرنے کے لئے شروع کی گئی ہم سے مسلم فرقہ کے وقار کے تحفظ کے لئے موثر اقدامات۔

تمام وقف املاک کو کرایہ کنٹرول قانون، شہری جائیداد کی حد بندی اور زرعی اصلاحات سے متعلق قوانین سے مستثنیٰ کیا جائے۔ جن وقف املاک کا حلیہ اس طرح تبدیل کر دیا گیا ہے کہ ان کی بحالی ممکن نہیں ہے، ان کا معاوضہ موجودہ بازار بھاؤ کے مطابق ادا کیا جائے۔

ازکار رفتہ جج کمیٹی قانون مجریہ ۱۹۵۱ء کی جگہ ایک نیا قانون بنایا

جائے۔

● سرلسانی فارمولہ کے تحت اردو کو پہلی زبان کے طور پر اختیار کرنے اور پرائمری اسکول کی سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بارے میں امتیاز کو ختم کیا جائے۔

● آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے ان تمام مرکزوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی کافی آبادی ہے ان کے تناسب سے اردو پروگراموں کے لئے وقت دیا جائے۔

● آسام میں ناجائز تارکان وطن کا سراغ لگانے کے لئے بنانے گئے قانون آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ مجریہ ۱۹۸۳ء کو برقرار رکھا جائے۔

(پانچ مسلم تنظیموں کا ایجنڈا ایک پریس کانفرنس میں جاری کیا گیا جس میں ان تمام تنظیموں کے نمائندے موجود تھے) سہر روزہ دعوت دہلی ۱۳/ جولائی ۱۹۹۹ء۔

اس مسلم ایجنڈا میں کیا دم خم ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے ہم چار اخباری تبصرے یہاں پیش کرتے ہیں۔ سہ روزہ دعوت دہلی کے مدیر ۱۹/ جولائی ۱۹۹۹ء کے اداریہ میں رقمطراز ہیں:

(کوئی شک نہیں کہ مسلم ایجنڈا مسلمانان ہند کی امنگوں اور ان کے احساسات کا ترجمان ہے اس میں شامل کئے گئے امور و مسائل حل طلب ہیں۔ پانچ تنظیموں نے انہیں اٹھا کر ایک دیرینہ ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ لیکن اس موقع پر نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ بعض بنیادی حقائق کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ان حقائق سے چشم پوشی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کسی بھی قسم کی خوش فہمی یا سادہ لوحی

مسائل پیدا کر سکتی ہے۔ ایک تو یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ ملک کے ارباب سیاست مسلمانوں کے ان مسائل سے واقف نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنے مزاج کے لحاظ سے یہ ارباب سیاست اتنے دیانتدار اور انصاف پسند واقع نہیں ہونے ہیں کہ جیسے ہی ان کے سامنے مسلمانوں کی یہ ضروریات پیش کی جائیں گی وہ بغیر کسی مصلحت کے ان کی تکمیل میں لگ جائیں گے۔ تیسرے یہ دیکھنا ہوگا کہ جن پارٹیوں کو سیکولر سمجھا جاتا ہے ان کے لیڈر فی الواقع کتنے سیکولر ہیں اور اپنی بات پر قائم رہنے کی کتنی جرات اپنے اندر رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سیکولرزم ان پارٹیوں کا عقیدہ نہیں کہ اس کی خاطر وہ ہر صورت حال کا سامنا کریں گی خواہ اس میں انہیں سیاسی لحاظ سے گھانا ہی ہو رہا ہو۔

سیکولرزم دراصل ان پارٹیوں کی حکمت عملی یا سیاسی ضرورت ہے اور مسلمانوں سے ان کی دلچسپی صرف ان کے دونوں تک محدود ہے۔ چونکہ اہم بات یہ ہے کہ قانون ساز اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن کا سوال اس انداز میں اٹھانے سے فرقہ پرست اور فسطائی حلقوں کو تقویت مل سکتی ہے، وہ مسلمانوں کے خلاف شور مچا کر نام نہاد ہندو اکثریت کو اور غلاما شروع کر دیں گے۔ لہذا یہ دیکھنا ہوگا کہ ریزرویشن جیسے حساس مسئلے پر وہ مسلم مخالف ماحول پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ نچلے اور پسماندہ طبقات پر مسلمانوں کے اس مطالبہ کا کوئی منفی رد عمل تو نہیں ہوگا۔ ریزرویشن کے سلسلہ میں، بالخصوص سرکاری

ملازمتوں کے تعلق سے کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے ہاتھ تو کچھ نہ آنے لٹان کے مخالف سیاسی طور پر مضبوط ہو جائیں۔ امید ہے مسلم مشاورتی گروپ کے ذمہ داران اپنی مہم آگے بڑھانے سے قبل ان حقائق کا جائزہ اچھی طرح لیں گے۔

ہفتہ روزہ اخبار نو دہلی نے ۲۱/۲ تا ۲۷ جولائی ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں لکھا ہے:

عام انتخابات کے موقع پر ملک کی پانچ بڑی مسلم جماعتوں کے درمیان اتحاد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جہاں تک ۳۲ نکاتی ایجنڈا کا معاملہ ہے تو وہ مسلمانوں کی ترقی و بہبودگی سے وابستہ ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج ملک میں جس طرح غیر یقینی سیاسی صورت حال ہے اور صرف مفاد پرستی کی سیاست کی جا رہی ہے کیا سیکولر جماعتیں فرقہ پرستی کے خلاف یا اس نام پر متحد ہو سکتی ہیں؟ جب بھی ملک میں انتخابات کا وقت آتا ہے تو سیکولر وٹوں کی تقسیم روکنے اور فرقہ پرست طاقتوں کو ہرانے کی اپیل کی جاتی ہے لیکن سیکولرزم کا نقاب لگائے جماعتیں آج بھاجپا کی انگلیوں پر ناچ رہی ہیں۔ سمتا پارٹی، ترنمول کانگریس، لوک شکتی جیسی پارٹی کے قائد سیکولرزم کا راگ الاپ رہے ہیں اور بھاجپا کی قیادت والے محاذ میں بھی شامل ہیں۔ جہاں تک غیر بھاجپا جماعتوں کا تعلق ہے تو کانگریس اور سماج وادی کے درمیان اتحاد اب ممکن نہیں دکھائی دیتا۔ اسی طرح بہوجن سماج پارٹی اور کانگریس کے درمیان اتحاد ممکن ہے۔ لیکن سماج وادی

کے ساتھ اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک علاقائی جماعتوں کا
 تعلق ہے تو بیشتر جماعتیں بھاجپا قیادت والے محاذ میں شامل ہیں۔
 ملک میں اب سیکولر ازم کی بقا کے لئے فرقہ پرست بھاجپا کو ہرانے کا
 نعرہ دم توڑ رہا ہے کیوں کہ نام نہاد سیکولر جماعتیں صرف اپنے مفاد اور
 بقا کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان حالات میں جب کہ سیکولر
 جماعتیں انتشار کا شکار ہیں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان اس
 وقت اختلافات میں مزید شدت پیدا ہوئی۔ جب مرکز میں بھاجپا سرکار
 اقلیت میں آگئی اور سیکولر جماعتیں متبادل حکومت کی جگہ ملک میں
 انتخابات کرانے میں دلچسپی لینے لگیں۔ تو ایسے حالات میں ملک کی سب
 سے بڑی اقلیتوں کی نمائندہ تنظیموں کی سیکولر جماعتوں سے اپیل کتنی
 کامیاب ثابت ہوگی۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ جہاں تک اس اتحاد کا
 تعلق ہے وہ قابل ستائش ہے۔ مگر صرف ایجنڈا بنا کر سیاسی جماعتوں
 کے ساتھ بات کرنے سے کیا ہوگا؟ اگر مسلمان الیکشن میں اس ایجنڈا
 کے تعلق سے کوئی رخ اپنائیں تو سیاسی جماعتوں پر انہیں یہ یقین کیسے
 آنے گا کہ وہ اس ایجنڈا پر واقعی عمل کریں گے؟ دوسرے سیاسی
 جماعتوں میں سے اگر کوئی اس کو ماننے کے لئے تیار ہوتی ہے تو پھر
 ان پانچوں تنظیموں کے رہنماؤں سے وہ جماعت یا جماعتیں حمایت کی
 بھی طلبگار ہوں گی اور وہ جماعتیں الیکشن میں ایک دوسرے کے
 مد مقابل بھی ہو سکتی ہیں۔ اس صورت میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا
 جانے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور پانچوں تنظیموں کے

ذمہ داروں کو اس پر اور بھی زیادہ گہرائی سے غور کرنا چاہیے۔
 اظہر معین صاحب نے روزنامہ منصف حیدر آباد ۱۱/ اگست ۱۹۹۹ء
 میں لکھا ہے:

امک اس صدی کے آخری ایام میں نازک سیاسی حالات سے
 دوچار ہے اور آئندہ چند دنوں میں انتخابات کا بھی سامنا ہے۔ ان انتخابی
 نتائج کے دور رس نتائج حاصل ہونے والے ہیں۔ ایسے میں مسلمانوں
 کو بڑی دوراندیشی اور سیاسی حکمت عملی کا مظاہرہ کرنے اور موجودہ
 سیاسی حالات میں نہایت ہی اہم اور کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔
 انتخابات سے قبل بعض تنظیموں نے مسلم مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے
 ایک منصوبہ عمل مرتب کیا ہے جسے سیاسی پارٹیوں کے سامنے پیش
 کرتے ہوئے اسے قبول کرنے والی سیاسی جماعتوں کی تائید کرنے کا
 اعلان کیا گیا، لیکن ان تنظیموں نے ملک کے مختلف ریاستوں کی سیاسی
 صورتحال کا صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے اور نہ ہی مقامی مسائل کو اپنے
 منصوبہ عمل میں شامل کیا۔ علاوہ ازیں مسلم تنظیموں کی جانب سے
 مرتبہ منصوبہ عمل صرف کانگریس پارٹی کو ہی پیش کیا گیا جسے اس نے
 قبول بھی کر لیا۔ اس منصوبہ عمل میں صرف مطالبات پیش کئے گئے
 لیکن مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی ترقی کے لئے کوئی ٹھوس پروگرام پیش
 نہیں کیا گیا۔ سیاسی سطح پر مسلمانوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے
 نمائندگی دینے کا مطالبہ کیا گیا لیکن اس خصوص میں کوئی واضح تیقن
 نہیں لیا گیا اور نہ ہی اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی کہ آئندہ

انتخابات میں ہی پارٹی مخصوص تعداد میں مسلم امیدواروں کو ٹکٹ دے۔ ماضی میں بھی یہ دیکھا گیا کہ انتخابات سے قبل سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے منشور مطالبات کو بلاچوں و چراں قبول کر لیتی ہیں چونکہ وہ کسی بھی صورت میں مسلم ووٹ بنک کو کھونا نہیں چاہتیں لیکن جب اقتدار میں آجاتی ہیں تو اپنے وعدوں اور دعوؤں کو نہ صرف فراموش کر جاتیں بلکہ مسلم دشمن اقدامات سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ہمارے پاس ایسی نظیر بھی موجود ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے قائم کردہ کمیشن کے سربراہ جب وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر پہنچ گئے تو انہوں نے خود اپنی سفارشات کو روبہ عمل لانے سے احتراز کیا لہذا مسلم تنظیموں کو صرف منشور مطالبات پیش کر کے مطمئن نہیں ہونا چاہیے کہ حکومت تشکیل پانے پر ان کے پیش کردہ پروگرام پر عمل آوری ہوگی بلکہ انہیں اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے۔

ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد صاحب روزنہ منصف ۱۳ / اگست میں لکھتے ہیں:

(اس مرحلہ پر مسلم قیادت کو بھی طے کر لینا چاہیے کہ بازار سیاست میں بے وزل بننے سے بہتر ہے کہ اپنے مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کا عزم کر کے انھیں۔ اگر مسلم قیادت یہ طے کرتی ہے کہ جو پارٹی اس مسلم ایجنڈے کو تسلیم کرتی ہے جو ملک کی پانچ سرکردہ مسلم تنظیموں کی جانب سے جاری کیا گیا ہے تو پھر آنے والے انتخابات میں مسلمان ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے

کہ جمیعتہ العلماء ہند، جماعت اسلامی ہند، کل ہند مسلم پرسنل لاء بورڈ، ملی کونسل اور مسلم مجلس مشاورت نے جس مسلم ایجنڈے کے خدو خال پر اتفاق رائے کر لیا تھا وہ تو منظور کر لیا گیا اور اخبارات میں اس کی اشاعت بھی عمل میں آگئی۔ لیکن تاہم تحریر ان جماعتوں نے ملک کی اہم سیاسی جماعتوں سے نہ کوئی رابطہ قائم کیا اور نہ ہی مسلم رائے عامہ کو مسلم ایجنڈے کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیس کروڑ کی ملت اسلامیہ ہند کا یہ قافلہ آنے والے انتخابات کے موقع پر بھی بے قیادت رہے گا اور ہر علاقہ کے مسلمان اپنے طور پر فیصلہ کریں گے جس سے سوائے انتشار کے اور کچھ نہ ہوگا۔ مسلم ایجنڈے میں جن امور کا تذکرہ کیا گیا وہ مسلمانان ہند کو گزشتہ پچاس سال سے درپیش ہیں۔ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن، مسلم پرسنل لاء میں مداخلت یا تبدیلی کے امکان کا خاتمہ، بابری مسجد کی تعمیر نو، شہر پسندوں کی شرارتوں اور مسلم مخالف ہم سے مسلمانوں کا تحفظ، اوقاف کی جائیدادوں کا تحفظ، اردو کی ترویج و ترقی اور آسام کے مسلمانوں کو غیر ملکی باشندوں کا ہوا کھڑا کرنے والوں کی ریشہ دوانیوں سے بچانا، یہ مسلم ایجنڈے کے خاص نکات ہیں۔ ملک کی جو بھی پارٹی ان نکات کو رو بہ عمل لانے کا وعدہ کرتی ہے مسلمان بہر حال اس کے حق میں سوچ سکتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں شامل بعض "کالی بھیزیں" اس مسلم ایجنڈے کو عام مسلمانوں سے اوچھل رکھ کر کسی ایک پارٹی کے کشکول

میں مسلمانوں کے ووٹ ڈالنا چاہتی ہیں۔ اگر ملک کی کوئی پارٹی اس سازش میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر ایک بار مسلمانوں کو الیکشن کے بعد کف افسوس ملنے کے سواء اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس تاریخ ساز الیکشن میں جس کے دروازے پر ہم پہنچ چکے ہیں ہمیں بہت ہی دوراندیشی اور مومنانہ فراست سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ ہمیں کسی پارٹی کے تعلق سے کوئی خوش فہمی یا سادہ لوحی کاشکار ہونے بغیر حقائق کی بنیاد پر اس کے حسن و قبح کا جائزہ لینا چاہیے اور بغیر کسی مصلحت کے ملت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اجتماعی فیصلہ کرنا چاہئے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے۔ کیونکہ ہمارے قائدین نے پہلے سے طے کر لیا ہے کہ ان کی ہمدردی کس پارٹی کے ساتھ ہے۔

یہ تبصرے بڑے احترام اور ادب کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن دینی زبان میں مسلم ایجنڈا کی بے مانگی اور سطحیت کو انہوں نے اجاگر کر دیا ہے۔ یہاں سوچنے کا یہ پائنٹ بھی ہے کہ جن چار فارمولوں کو بار بار بار پچاس سال تک آزمایا گیا ہے انہیں کو پھر آزمانے کا کیا جواز ہے۔ کیوں نہ ہم تھوڑا توقف کر کے کوئی دوسرا نسخہ تلاش کریں۔

”موجودہ پالیمرانی سیاست اور سیاسی نظام کی سب سے بڑی نا انصافی یہ ہے کہ مسلم آبادی کے لحاظ سے فیصلہ کن موثر حلقہ ہائے انتخابات کو درج فہرست ذاتوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور کئی حلقوں کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ مسلم ووٹوں کی اہمیت گھٹ گئی جس کی وجہ سے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں مسلمان ارکان کی تعداد

کم ہو رہی ہے۔ ساتویں لوک بھٹا میں مسلم ارکان کی تعداد ۴۶ تھی۔ آٹھویں لوک بھٹا میں ۴۱ ہو گئی۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ میں ۳۳۔ ۱۹۹۱ میں ۲۸۔ ۱۹۹۵ میں ۲۷۔ اور بارہویں لوک بھٹا میں ۲۸ رہ گئی۔ اس طرح مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن انتہائی کمزور ہو گئی ہے۔ قومی اقلیتی کمیشن نے حالیہ مردم شماری کی رپورٹ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اقلیتیں ملک کی آبادی کے ۱۸.۵۹ فیصد پر مشتمل ہیں۔ اگر ان اقلیتوں میں مسلمانوں کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ۱۴ کروڑ ہے۔ لیکن ملک کی دولت اور اقتدار میں ۳ فیصد سے زیادہ حصہ مسلمانوں کو نہیں مل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نوبت تک کس نے پہنچایا ہے۔ اس کے جواب میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب کچھ کراہر سیکولر لوگوں کا ہے اس لئے کہ ۱۳ ماہ ۱۳ دن کے علاوہ چالیس سال ملک کی زمام کار سیکولر پارٹیوں بالخصوص کانگریس کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود سیکولر پارٹیوں سے آس لگا کر بیٹھنا کہاں کی دانشمندی ہوگی۔ یہی وہ بات ہے جو الیاس اعظمی صاحب سابق ممبر پارلیمنٹ نے کہی ہے:

(آج پچاس سال گزرنے کے باوجود مسلم اقلیت سیاسی طور پر لاپوار ہی نظر آرہی ہے۔ ملک کی آزادی کے دن تقریباً چار کروڑ کی تعداد والی آج پچاس سال بعد جو اپنے کو پچیس کروڑ کہتی نہیں تھکتی لیکن سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تیرہ کروڑ ہونے کے باوجود اپنا سیاسی طور پر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ آج سے پچاس سال قبل جس چوراہے پر

کھڑی تھی آج بھی وہیں نظر آرہی ہے۔

میری اس بات سے بہت سے لوگ اتفاق نہیں کریں گے کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج مسلمان کاروباری طور پر کافی مضبوط ہو گیا ہے وہ عرب دنیا سے روپے کمانے کے بعد اس انداز کا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں مکان خریدتا ہے۔ اپنے ذاتی اخراجات سے ایک بہتر زندگی گزارتا ہے اور اپنی شادی بیاہ کی تقریبات میں اپنے ہم وطنوں کو دوسرے نمبر پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو بیشک مسلمانوں نے ترقی کی ہے جس سے کسی کو انکار بھی نہیں ہے۔ لیکن ایسے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔

جس ترقی کی بات میں کر رہا ہوں اس میں تو ہم بہت پیچھے چلے گئے ہیں چھوٹی سے چھوٹی تعداد رکھنے والی اقلیت بھی آج اپنا سیاسی وزن محسوس کراتی ہے لیکن ہم تیرہ فیصد کی تعداد رکھنے والے مسلمانوں نے وعدوں کے سہارے ہی پچاس سال گزار دیے اور پھر بھی ہم مزید وعدوں پر بھروسہ کرنے کو تیار ہیں۔

جب کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کی آزادی کے وقت ہمارے تیس فی صد افراد سرکاری نوکریوں میں تھے جو آج گھٹ کر صرف دو فی صد رہ گئے ہیں۔ آج ہماری آبادی کے تیس فی صد افراد ندی کے پشتوں پر نالوں کے کنارے، سڑکوں کے کنارے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ آج ہمارے مسلم محلے گندی بستیوں کے نام سے مشہور ہیں۔ آج بھی مسلم علاقوں میں اسکولوں، شفاخانوں، مستورات کے لئے کڑھائی بنانی

کے تربیتی مراکز کا فقدان ہے۔ تقریباً بیس ہزار فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر احساس جرم پیدا کرنے کی کوشش کا کیا جانا، بابری مسجد میں بزور طاقت مورتیوں کا رکھا جانا۔ سب انسپکٹر رام دیو دوسرے کے ذریعے لکھائی گئی ایف آئی آر پر عدالت کا کوئی کارروائی نہ کرنا۔ مسجد کو دفعہ ۱۴۵ کے تحت قرق کرنا اور مسلمانوں کے لئے مسجد سے دوسرے میسر دور رہنے کے احکامات صادر کرنا۔ مسجد کا نالا کھلوانا، متنازعہ جگہ پر شیلانیاس کرنا اور پھر فرقہ پرست تنظیم آریس ایس اور اس کے سیاسی بازو بھاجپا کی سرپرستی میں ہی اس کی ذیلی جماعتوں کے ذریعہ بابری مسجد کو شہید کر دیا جانا۔ یہ سب وہ حالات ہیں جو پچاس سال میں مسلمانوں کے حصے میں آئے۔

اس میں تعجب کی بات یہ ہے کہ ان پچاس برسوں میں مسلمانوں کے سب سے پہلے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ پھر مسلمانوں کی لیڈر اندرا گاندھی ہوئیں۔ پھر مسلمانوں کے لیڈر بہو گنا ہونے، پھر مسلمانوں کے لیڈر چودھری چرن سنگھ ہونے، پھر مسلمانوں کے لیڈر راجیو گاندھی ہونے، پھر مسلمانوں کے لیڈر نرسمہا راو ہونے، پھر مسلمانوں کے لیڈر ملائم سنگھ یادو ہونے، اس کے بعد لیڈر کون ہو گا یہ وقت ہی بتائے گا لیکن یہ سب وہ لیڈران ہیں جنہیں گزشتہ پچاس برسوں میں مسلمانوں نے ووٹ دیا جس کا نتیجہ سامنے ہے۔

مندرجہ بالا لیڈران وہ ہیں جنہیں سیکولر کہا جاتا تھا اور جن کے ہاتھ

میں اقتدار بھی تھا وہ اپنے اقتدار کے ذریعہ مسلم اقلیت کو پریشانیوں سے نجات دلانے کی حالت میں تھے۔ لیکن ان لیڈران نے کسی ایک معاملہ میں بھی فرقہ پرست تنظیموں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ جس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات جتنے بھی تحقیقاتی کمیشن تشکیل پائے ان میں سے کچھ کے علاوہ زیادہ تر کی رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی اور اگرچند کی رپورٹ منظر عام پر آ بھی گئی تو اس رپورٹ کی بنیاد پر جن سرکاری یا غیر سرکاری افراد پر الزامات ثابت ہونے ان میں سے کسی ایک کے خلاف بھی قانونی کارروائی کر کے سزا نہ دلائی جاسکی۔ بھونڈی (مبار شرا) کے فساد کے بعد جسٹس مادان کمیشن تشکیل پایا تھا جس نے اپنی رپورٹ کے آخر میں کہا تھا کہ ایسے لوگ پولیس کی وردی پہنے ہوئے تھے جن پر پولیس کی وردی زیب نہیں دیتی۔ ان لوگوں نے پولیس کی وردی کی بے عزتی کی ہے۔ اس کے باوجود کسی ایک کو بھی سزا نہیں مل پائی۔ اسی طرح مراد آباد میں ۱۹۸۰ کا فساد ہوا تھا اس کی رپورٹ پر بھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ میرٹھ، ہاشم پورہ اور ملیانہ کے واقعات میں جب کمیشن کی رپورٹ سے ثابت ہو گیا کہ بدنام زمانہ پی اے سی کے ذریعہ ۲۲ کڑیل نوجوانوں کو گولی سے اڑا دیا گیا کمیشن کے ذریعہ پی اے سی کے جوانوں کو نامزد بھی کر دیا گیا لیکن آج تک وہ آزاد گھوم رہے ہیں۔

اس کے برعکس ۳۱ / اکتوبر ۱۹۸۴ کو مسز اندرا گاندھی کے قتل کے رد عمل میں سکھ قوم کے خلاف فسادات کا سلسلہ شروع ہوا

جس میں کافی تعداد میں سکھ قوم کے افراد مارے گئے لیکن سکھ قوم نے ایک نساد پر ہی دہلی ہائی کورٹ جا کر انصاف حاصل کر لیا۔ گناہ گاروں کو سزاء دلوائی اور اپنے رشتہ داروں کی موت کا معاوضہ دس، دس لاکھ روپے منظور کرایا۔ یہ سکھ قوم بھی ہندوستان کی ایک اقلیت ہے جو مسلمانوں کے ۱۳ فیصد کے مقابلے میں صرف ۲ فیصد ہی ہے۔

یہ تو میں، ہماری طرح نہیں کہ ہم انتظار کرتے رہے کہ یہ سیکولر پارٹیاں اپنے کئے وعدوں کے مطابق بابری مسجد کی حفاظت کے لئے اجودھیا میں موجود رہیں گی اور فرقہ پرستوں کے سامنے سینہ سپر ہوں گی لیکن اجودھیا میں کسی ایک بھی سیکولر لیڈر کا پتہ نہ تھا اور بابری مسجد آسانی کے ساتھ شہید کر دی گئی۔ اور حکومت وقت کے سربراہ مسٹر زسمہاراؤ کی خاموش حکمت عملی نے اس کام کو اور بھی آسان بنا دیا۔ کانگریس اور سیکولر پارٹیوں کے لیڈران اپنے اپنے گھروں میں ٹی وی پر یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت خون کے آنسو روتی رہی اور قومی یکجہتی کو نسل کی قرار دیں خاموش تماشائی بنی رہیں۔ آج کانگریس نے اپنے سابقہ رویہ پر معافی مانگی ہے تو تمام سیکولر پارٹیوں کو بھی مسلمانوں سے معافی مانگنی چاہئے کیونکہ یہ پارٹیاں بھی بابری مسجد کے انہدام میں برابر کی شریک ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سیکولر پارٹیاں ہمارے ووٹ حاصل کرنے کے بعد ہمارے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتیں ہیں۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم ۱۳ فیصد ہونے کے باوجود حکومت میں حصہ دار نہیں بن

پاتے کیونکہ ان کو اپنی پارٹی کے وہپ کا پابند ہونا پڑے گا۔ اگر انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دے دیا تو ان کی ممبری ختم ہو جائے گی۔ ایسے حالات میں ہماری حالت بالکل ایسی ہو گئی ہے کہ ہم بس میں دھکا لگا کر اسے اسٹارٹ کرنے کے بعد دوسری بس میں دھکا لگانے کے لئے الیکشن کا انتظار کرنے لگتے ہیں یعنی جس بس کو ہم نے دھکا لگا کر اسٹارٹ کر دیا تھا اس کا ڈرائیور ہاتھ نکال کر ہمارا شکریہ ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا بس میں سوار کرنا تو الگ بات ہے۔ (رہنمائے دکن۔ ۲۵ / اپریل ۱۹۹۹ء)

مسلمانوں کی لاچاری، بے بسی اور محرومی کی آخر وجہ کیا ہے کہ پچاس سال کے دوران کوئی نسخہ کام نہ آیا اور کوئی دوا بھی ان کے درد کا درماں ثابت نہیں ہوئی جبکہ اسی سرزمین پر دوسری اکائیاں بھی ہیں جو اپنے مسائل کا حل نکال لیتی ہیں۔ اور جن کا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے جمہوریت کو کما حقہ پہچانا نہیں بحیثیت مجموعی انھوں نے سادہ لوحی کا ثبوت دیا۔ انھیں جمہوریت کے فریب میں صرف مبتلا ہی نہیں کیا گیا بلکہ بہلا بہلا کر فریب میں رکھا گیا۔

اس ضمن میں مولانا محمد اسحاق سندیلوی "استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ" کے چند الفاظ لائق ملاحظہ ہیں۔

دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پر فریب اور
 پر تبلیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں ہے، بظاہر یہ ایک
 جنت ہے جس میں خوف اور حزن کا نام و نشان بھی نہیں ہے، جس
 میں شخصی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے۔ جس میں انسانیت کی قدر و
 قیمت پہچانی جاتی ہے اور جس میں غربت و امارت کا کوئی سوال باقی
 نہیں رہتا، لیکن جب اس کے باطن پر نظر کیجائے تو یہ ایک جہنم نظر آتی
 ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں جس میں انسانیت
 کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے۔ جس میں شخصی آزادی کا گھونٹ
 دیا جاتا ہے اور جس میں غرب و کمزور کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

(رواداری کا وعظ کہنے والے ذرا سطحیت کو چھوڑ کر حقیقت پر
 نظر کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ دنیا کی سب قومیں یہی کر رہی ہیں۔
 مذہبی اقلیتوں کو وضع قانون کا منصب واقعہ کے لحاظ سے کہاں نصیب
 ہوتا ہے؟ نگاہ حقیقت ہیں میں تو ہر جگہ ”دیواستبداد“ جو جمہوری ”قبا“
 میں ”پائے کو ب“ دیکھ رہی ہے، اور دنیا کو ”آزادی کی نیلیم پری“ کا
 فریب دینا۔ جمہوریت کا بین الاقوامی مزاج بن چکا ہے۔ طوالت کا اندیشہ نہ
 ہوتا تو ہم نام بنام ایک ایک ملک کی جمہوریتوں کی نقاب فریب چاک
 کر کے ان کی اصلی شکل دکھا دیتے۔ اور یہ مکروہ واقعہ نظر آجائے کہ ان میں
 مغلوب قوموں کے نمائندے صرف اس لئے مجالس قانون ساز میں
 باریاب ہوتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کو ذبح کرانے میں آلہ کار بن سکیں یا کسی
 غالب پارٹی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں اور دنیا کے سامنے حکومت کی

رواداری (بے تعصبی) کے گیت گاتے رہیں)۔

”اگر باطل مذاہب نے اعتقادی شرک کی ترویج کی ہے تو یہ

باطل نظریات سیاسی شرک پھیلا رہے۔“

(”اسلامی سیاست“ مطبوعہ دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ)

مسلمانوں نے حاکمیت الہ کی بنیاد پر سیاست کو چھوڑ کر حاکمیت

جمہوریہ والی سیاست کو اپنایا۔ لیکن جمہوریت کو ماننے کا بھی حق ادا نہ

کر کے خسرت الدنیا والاخرہ کے مصداق بنے ہوئے ہیں

آخرت کا انجام روز قیامت معلوم ہوگا دنیا کے خسران کا رونا تو ہر ایک

رو رہا ہے۔ دین کے رمز شناس اور دور جدید کے باطل نظریات کے

نباض نے کہا تھا کہ جمہوریت میں حقوق ملتے نہیں بلکہ چھینے جاتے

ہیں لیکن مسلمانوں نے عام طور سے اسی کو غنیمت سمجھا کہ جمہوریت نے

آنسو بہانے اور رونے کا حق دیا ہے۔ اس کے بعد جس نے ہمدردی کا

اظہار کیا اور حسین لفظوں میں حسین وعدے کئے اس کو الیکشن میں

ووٹ دے دیا۔ اور جب وعدہ کرنے والوں نے وعدہ پورا نہیں کیا تو گدے

اور شکوہ کیا حالانکہ جمہوریت نے جہاں گدے شکوہ کرنے، رونے دھونے

اور مطالبات کی فہرست پیش کرنے کا حق دیا تھا۔ وہیں اس نے چند

جدید ہتھیار بھی دئے تھے کہ ان کو استعمال کر کے اپنے مطالبات منوا

سکتے تھے لیکن مسلمانوں نے ان ہتھیاروں کو کبھی استعمال نہیں کیا۔

ان کی مثال اس گائے کی ہوگی۔ جو صرف دودھ دینا جانتی ہے نہ سینگ

چلاتی ہے اور نہ لات مارتی ہے۔ مسلمان ووٹ دے کر کامیاب کرتے

ہیں لیکن کامیاب ہونے والا اپنے سارے وعدے بھول جاتا ہے تو وعدے یاد دلانے کی بھی ہمت نہیں کرتے۔

جمہوریت کے جدید ہتھیاروں میں - اسرائیلک - دھرمادینا - ریالی پہیہ جام کرنا اور جیل بھرد کے پروگرام ہیں۔ قطع نظر اس میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط جن لوگوں نے اپنی کوئی بات منوانے کے لئے ان ہتھیاروں کو استعمال کیا۔ ان کی بات کسی نہ کسی درجہ میں مافی گئی اور ان کے مطالبوں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکا۔ حکومت کسی پارٹی کی ہو جب اس کے سامنے رکاوٹ کھڑی کی جاتی ہے تو وہ رک کر سوچتی ہے حکومت کے پاس چاہے کتنی ہی قوت ہو اور وہ خواہ کتنی ہی مضبوط حکومت ہو۔ لیکن پانچ سو لوگ کسی مطالبہ کو منوانے کے لئے سینہ کھول کر کھڑے ہو جائیں تو وہ ہزار پانچ سو لوگوں کو گولی سے بھون نہیں سکتی ہے۔ حکومت کے پاس ہزار ہا ملزموں کو بند کرنے کے لئے جیل ہوتی ہے۔ مگر ایک ہزار افراد کسی ایشو پر گرفتاری دینے کے لئے تیار ہو جائیں تو حکومت اتنے لوگوں کی رایوں کو اپنے خلاف ہونا آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی سو پچاس نہیں دس بیس آدمی بھی دھرنے پر بیٹھ جاتے ہیں تو حکومت در دسر میں تو ضرور مبتلا ہو جاتی ہے ہزار دو ہزار لوگوں پر مشتمل جلوس اور ریالی نکالی جانے تو حکومت خاموش نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے کچھ نہ کچھ بند و بست کرنا پڑتا ہے اور نیچے سے اوپر تک لکر اور تشویش لاحق ہو جاتی ہے تمام پبلک کامو ضوع گفتگو بن جاتا ہے اور اگر جلوس میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تو اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر اندر

اور باہر تبصرے ہوتے ہیں۔ کسی موقع پر پہنچا جام کرنے کا اعلان اگر کسی گروہ نے کیا تو بڑے پیمانے پر حکومتی عملہ کو انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ غرض یہ کہ جن لوگوں سے حکومت کو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری راہ میں مشکلات کھڑے کر سکتے ہیں ان کی آواز پر کان دھرا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہیں ہے اس راہ کو اپنانے سے پولس کے ڈنڈے کھانے پڑتے ہیں۔ سڑکوں پر گھسیٹے جانے کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے قید و بند کا مرحلہ بھی آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لیکن ایسے گروہ کی باتوں کو نظر انداز کرنا کسی حکومت کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

اب جائزہ لے کر دیکھنے۔ مسلمانوں نے اپنے مطالبوں کو منوانے کے لئے ان ہتھیاروں کو کتنا استعمال کیا ہے اگر جمہوریت کے دئے ہونے ہتھیاروں کو استعمال نہیں کیا۔ صرف ووٹ دیتے رہے۔ اپنی ٹوپی، موزے، دستانے اور شیردانوں کو گرد و غبار سے بچانے کی فکر دامن گیر رہی ہے تو جمہوریت کے دئے ہوئے میدان میں انھیں فتح کیسے نصیب ہو سکتی تھی۔ صرف قراردادیں اور ریزولیشن پاس کرنے سے کسی کا کیا بگڑتا ہے اور کوئی کیوں آپ کے لئے زحمت کرے گا۔

مختصر یہ کہ مسلمانوں نے ایک غلط اور غیر مفید نسخہ دوا ساز سے بندھوایا مگر استعمال اس کو بھی پورا نہیں کیا تو ظاہر ہے کہ ان کا مرض کیسے ختم ہوتا اور ان کے دکھ درد کا کیسے مداوا ہوتا۔ حکمران طبقہ ہمیشہ

طاقت کی زبان سمجھتا ہے طاقت خواہ کسی طرح کی ہو اس مقام پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے دکھ کا علاج کیا ہے۔

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہمارے دکھ کا علاج ایسے نسخہ سے ہو گا جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے اخذ کیا گیا ہو۔ لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح اولها۔ اس امت کے بعد والے لوگ اسی چیز سے درست ہوں گے۔ جس سے پہلے کے لوگ درست ہوئے تھے۔ یہ صحیح اور سچی ایمان کی بات ایسے ہمارے دماغوں سے نکل گئی ہے کہ ہمارا بڑے سے بڑا آدمی بھی ملک و ملت کے سدھار اور نجات کے موضوع پر بولتا ہے تو یہی بولتا ہے کہ ہمارے سارے امراض کا علاج جمہوریت اور سیکولرزم کے بقا اور استحکام میں ہے یہ بولنے کی ہمت اور توفیق نہیں ہوتی کہ سارے جہاں کی بیماریوں کے لئے نسخہ شفا اسلام میں ہے قرآن میں ہے۔

آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں گے تو یہ ماننے کے لئے مجبور ہونگے کہ مسلمان اس وقت جس شکل میں بھی سیاسی عمل کر رہے ہیں وہ بحیثیت مسلمان نہیں کر رہے ہیں کیونکہ مسلمان ایک صاحب نظریہ اور صاحب عقیدہ ملت ہیں جس کے پاس عقیدہ توحید پر مبنی ایک دستور، ایک تفصیلی قانون "فقہ" اور مکمل نظام ہے وہ معیشت، معاشرت، اور سیاست کے باب میں کچھ ایسے بنیادی اصول رکھتے ہیں۔ جو وقت کے مروجہ اصول سیاست، معاشرت اور معیشت سے بالکل جدا گانہ ہیں لیکن مسلمان ان اصولوں کو لے کر سیاست میں شریک

نہیں ہو رہے ہیں اور نہ برسر اقتدار پارٹی اور اپوزیشن ان اصولوں کے ساتھ انھیں کچھ دینے کے لئے تیار ہیں بلکہ انھیں گوارا کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں ان کے نزدیک مسلمانوں کی جو حیثیت بھی بنتی ہے وہ یہ کہ بھارت کا ایک اقلیتی گروہ ہے جو بھارت کے دستور کے دئے ہوئے کچھ حقوق اور اختیارات کا مستحق ہوتا ہے۔ ان کی حیثیت اور مقام کا تعین دستور ہند کرتا ہے نہ کہ قرآن اور سنت، وہ اللہ اور اس کے رسول کے ماتحت نہیں ہیں وہ دستور ہند کے ماتحت ہیں۔ وہ شریعت کے محکوم نہیں ہیں آئین ہند کے محکوم ہیں یہ حقیقت واقعہ ہے جس کو تسلیم کئے بغیر ہمیں کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن اسکو برضاء و رغبت قبول کرنا اور اسی پر راضی اور قانع ہو کر محض حقوق طلبی کی سیاست پر قناعت کرنا اور اسی کو کافی سمجھنا نہ عقلی لحاظ سے صحیح ہے اور نہ دینی اعتبار سے اس لئے کہ دستور اسلامی کے بجائے کسی دوسرے کے تابع اور محکوم بن کر حقوق طلبی کی سیاست اختیار کرنے کا آخری نتیجہ غیر اسلامی تہذیب میں ضم ہو جانا ہے۔ اس لئے کہ جس حالت میں پچاس سال گزرے ہیں۔ حقوق طلبی والی سیاست کے ذریعہ آئندہ اس حالت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آسکتی اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ جو تبدیلی بھی ہوگی وہ زوال اور انحطاط کی طرف مائل ہوگی جس کا اندازہ ہمیں اقتدار اور دولت میں مسلمانوں کی حصہ داری کو دیکھ کر ہوتا ہے کہ کبھی پارلیمنٹ میں ۳۶ مسلمان ممبر تھے اور اب ۲۸ رہ گئے ہیں آزادی کے وقت سرکاری نوکریوں میں ۳۰ فیصد مسلمان تھے اب

۲ فیصد باقی ہیں اسی طرح غیرت دینی اور قومی حمیت میں کمی آئی ہے اور اپنی تہذیب زبان اور اپنے شخص کے تحفظ کے لئے مدافعت کو شش اور احساس زیاں کا گراف بھی ڈاون ہے فرض کیجئے اسی طرح اسی کیفیت میں سو دو سو سال ملت پر گزر جائیں تو ہماری حالت کیا ہوگی دل پر ہاتھ رکھ کر غور فرمائیے اور بتائیے کہ اکیسویں صدی کے ختم تک ملت زبوں حالی کے کس مقام تک پہنچے گی

لہذا دینی اعتبار سے موجودہ حقیقت واقعہ کو بخوشی قبول کرنا اور موجودہ سیاسی حکمت عملی کو کافی سمجھنا اور اس پر راضی اور خوش رہنا قطعاً صحیح نہیں ہے اس لئے کہ

(۱) کوئی شخص ہو یا کوئی قوم یا گروہ یا کوئی پارٹی مسلمان کسی کا مستقل تابع دار اور محکوم بن کر نہیں رہ سکتا اس نے اللہ اور رسول کی تابع داری اور محکومیت بلا کسی شرط اور بلا کسی استثناء کے قبول کر لیا ہے اس نے اللہ کو معبود حاکم آمر اور نافرما بلا شرکت غیر کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ کر مان لیا ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح اللہ کی عبادت میں کسی غیر کی شرکت مسلمان کے نزدیک ناقبول ہے اسی طرح اطاعت مطلقہ میں بھی اللہ اور اسکے رسول کے سوا کسی کو شریک کرنا ازروئے کلمہ توحید ناقابل تسلیم ہے اس کے لئے صرف ایک آیت قرآنی بطور دلیل کے کافی ہوگی

۱ واطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم وان
تتازعتم في شئ فردوه الى الله والرسول ان كنتم تو

منون بالله واليوم الآخر ذلك خير واحسن تاويلا سورة
النساء ٨٩

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے
صاحب امر کی اور اگر تم کسی چیز میں جھگڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی
طرف لوٹناؤ

اللہ اور اسکے رسول کے علاوہ اولی الامر کی اطاعت کے لئے
دو شرطیں ہیں اول ان کا مومن ہونا دوسرے اللہ اور اسکے رسول کے
خلاف نہ ہونا

۱۔ امت مسلمہ اپنے منصب اور ذمہ داری کے لحاظ سے رسول
اللہ کی جانشین ہے قرآن نے صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ ہر
رسول مطاع ہوتا ہے۔ یعنی اسکی اطاعت کی جاتی ہے سب لوگ اسکے
تابع ہوتے ہیں وہ کسی کا تابع اور مطیع نہیں ہوتا ہے۔ اس روشنی میں
امت مسلمہ کی حیثیت بھی اس زمین پر مطاع کی ہے۔ وہ کسی کی تابع
اور مطیع اور ماتحت نہیں ہو سکتی۔

۲۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ سورة النساء

۶۳

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا ہے مگر اس لئے کہ اللہ کے
اذن سے اسکی اطاعت کی جائے

اس مضمون کی تائید آیت وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ سے
بھی ہوتی ہے لہذا اپنے کو اقلیت اور بے مایہ تصور کرنا پس ماندہ

طبقات میں شمار کرنے کے لئے درخواست کرنا اور تحفظات کی بھیک مانگنا کسی طرح امت مسلمہ کے لئے زیبا نہیں

مسلمانوں کو خیر امت اور امت وسط کا لقب دیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے سوالی بن کر نہ آئے۔ بلکہ اللہ کے بندوں کو مادی اور روحانی ہر اعتبار سے دینے والا انھیں بننا ہے۔ اور اونچے مقام پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو بتانا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے حق کیا ہے اور باحق کیا ہے پھر اس کی حیثیت صرف واعظ اور ناصح کی بھی نہیں ہے دنیا میں عدل اور قسط قائم کرنے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔

۳ کنتم خیر امة اخر جت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر وتؤمنون باللہ (ال عمران - ۱۱۴)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

۴ وكذلك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویكون الرسول علیکم شہیدا

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا تاکہ لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔

۵ اتبعوا ما انزل الیکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء (اعراف)

تم اتباع اس چیز کی کرو جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور اتباع

نہ کرو اللہ کے سواء دوسرے اولیاء کی امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت حق کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ غلبہ دین کی جدوجہد بھی اس پر فرض ہے اور غلبہ دین کے لئے وہ سب کچھ کرنا جو اللہ اور رسول نے بتایا ہے

۶ هو الذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لیظہرہ
على الدین کلہ ولو کرا المشرکون (الصف)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ دین حق کو تمام دینوں پر غالب کر دے چاہے مشرکین ناپسند کریں گویا میدان سیاست میں مسلمانوں کی منزل اور گول کو یہ آیت متعین کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ رسول کا مشن دین حق کو تمام دینوں پر غالب کرنا تھا۔ اس لئے مسلمان ملت کا مشن بھی یہی ہونا چاہئے۔ سیاست کے میدان میں جتنے گروپ بھی کام کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی نظریہ اور نظام کو غالب اور حکمران بنانے کی بات کرتے ہیں اس پس منظر میں مسلمان کا سیاسی مشن عقیدہ توحید پر مبنی نظام اسلامی کو غالب اور حکمران بنانے کی کوشش کرنے کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

آیت نمبر ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ما انزل الیکم“ و جی الہی کے علاوہ ہر فکر، ہر خیال ہر نظریہ اور ہر عقیدہ خواہ کی ”کسی شکل میں ہو“ اتباع سے منع کیا گیا ہے اس لئے زندگی کے ہر میدان میں جدوجہد کرتے وقت اس بات کا خیال رہنا چاہئے کہ ہم وحی کی پیروی کریں۔

لوگوں کے اہواء کی اتباع سے محفوظ رہیں اس حکم کا اطلاق سیاسی میدان میں بھی ہوگا

آیت نمبر ۳-۴ میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان کو اپنے منصب اور مقام کا خیال ہونا چاہئے زندگی کے کسی میدان میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں نیچے مقام پر کھرا نہیں ہونا چاہئے۔ ان کا دست نگر بننے کا مظاہرہ نہ ہو۔ اور اس کردار کا سیاسی زندگی میں مزید نمایاں ہونا از بس ضروری ہے۔

آیت نمبر ۱-۲ سے کھلے طور پر سمجھ میں آتا ہے کسی مرحلہ اور کسی حالت میں مسلمان کا کردار یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ اور رسول کی سند کے بغیر کسی اطاعت کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈال لے

ان قرآنی اصولوں کی روشنی میں ہماری موجودہ سیاسی حکمت عملی اور اس کی بنیادوں کا غلط ہونا کھلے طور پر دیکھا جاسکتا ہے حقوق طلبی کو سیاسی مقصد بنانا اور پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو چار فارمولے آزمائے گئے ہیں وہ بھی غلط ہیں اس لئے کہ ہر فارمولہ میں قرآن کی کسی نہ کسی تعلیم کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ جہاں تک ان فارمولوں کے بے فیض اور ناکام ہونے کا سوال ہے اس کا جواب گزشتہ پچاس سال کے تجربہ نے لکھ دیا ہے اس کا کم سے کم تقاضہ یہ ہے ان چاروں فارمولوں کو کچھ عرصہ کے لئے ہم چھوڑ دیں اور کوئی نیا فارمولہ تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اصل مشن غلبہ دین کو چھوڑ کر حقوق طلبی کی سیاست نے ملک کی اکثریت کو جو ہمارا دشمن بنا دیا ہے

ممکن ہے اس میں کچھ کمی ہو جانے اور فسطائی قوتوں کو غذا ملنی بند ہو جانے یہ ایک عارضی اور ضمنی فائدہ ہو سکتا ہے سیاسی مفادات کی بنا پر جو اختلافات ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں ان میں بھی کمی واقع ہو جانے گی۔

اس کے علاوہ ہم انبیاء علیہم السلام کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے وقت کے شرک اور الحاد کی بنیاد پر چلنے والے سسٹم سے الگ رہ کر اپنے مشن کی مہم چلائی۔ بنی اسرائیل جن کے حالات سے ہندوستانی مسلمان ملت کے حالات زیادہ مشابہ ہیں۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کے سسٹم سے بالکل الگ رہ کر اپنی مہم چلائی۔ اس طرح نبی آخر الزماں نے مشرکانہ سسٹم سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی مہم جاری رکھی۔ حتیٰ کہ مشرکین نے اقتدار اور دولت میں بڑا حصہ دینے کی پیشکش کی تو بھی اس کو قبول نہیں کیا اور وقت کے جاری اور حکمران سسٹم سے باہر رہ کر جدوجہد کرتے رہے یہاں تک کہ بڑے سے بڑا سیاسی مقصد حاصل کر لیا

ان وجوہ کی بنیاد پر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ صحیح ہے اور نہ مفید کہ وہ اقتدار و دولت میں حصہ داری اور دوسرے مطالبوں، اسمبلیوں میں نمائندگیوں اور ملازمتوں کے لئے کشمکش ترک کر دیں۔ یہ روش اور طریقہ کار بحیثیت مجموعی ملت اسلامیہ کے لئے دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں مضر ہے

یہ کوئی منفی کام نہیں ہے بلکہ غلط لائن چھوڑ کر صحیح لائن پر

گازی کو ڈالنا ہے وہ صحیح لائن یہ ہے کہ

۱۔ بلا کم و کاست پورے دین کی دعوت دی جانے نہ کسی سے مرعوب ہوا جانے اور نہ کسی کا خوف کھایا جانے مذاہب کی جانب سے عبادت میں پیدا کئے ہوئے شرک کے خلاف بھی آواز لگانی جائے اور اطاعت مطلقہ میں جدید نظریات کے شامل کئے ہوئے شرک کی تردید بھی کی جائے۔ اور بتایا جائے کہ جس طرح بتوں کی پوجا انسانیت کے لئے تباہ کن ہے اسی طرح انسان پر انسان کی حکومت بھی تباہی کا موجب ہے خواہ فسطائیت کی شکل میں ہو یا جمہوریت کی صورت میں۔ عبادت اور اطاعت دونوں کے سلسلہ میں توحید کے کھرے کھرے تقاضے پیش کئے جائیں۔ شرک جس صورت میں بھی اور جہاں بھی پایا جائے گا دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں باعث ہلاکت ہوگا۔ یہ بات واضح انداز میں رکھی جائے۔

دعوت کے اس مفہوم کے ساتھ جو لوگ بھی اکٹھا ہوں ان کو منظم کیا جانے ان کی تربیت اور تزکیہ کیا جانے اور پھر ایک منظم جتھے کے ساتھ بے لاگ بر ملا دونوں انداز میں راست اسلام کی طرف بلایا جانے یہاں تک کہ ملک میں قومی کشمکش کے بجائے حق و باطل اور توحید اور شرک کی کشمکش شروع ہو جائے۔ اس وقت جب کہ ہندو تو اور سیکولرزم دو آپشن ہیں اور لوگوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ کس کو اختیار کیا جائے اور کس کی تائید کی جائے ہماری کوشش ہو کہ دو کے بجائے تین چیزیں سوالیہ نشان کے طور پر ابھر کر منظر عام پر آجائیں کہ

ان تینوں میں سے کس کو اختیار کیا جائے اور کس میں ملک کی اور انسانیت کی نجات اور فلاح ہے۔ ہندو تو۔ سیکولرزم یا اسلام؟

۲۔ اپنے تحفظ اور حقوق کو ایشو بنانے کے بجائے پوری خلق خدا کی فلاح و بہبود کے لئے ہم چلائی جانے اور ہر موقع پر ان کے دکھ درد میں شریک ہوا جائے۔ ظلم و نا انصافی جہاں بھی ہو اس کے خلاف آواز اٹھائی جانے اور نیکی اور اچھائی کی تائید بلا کسی تعصب اور ذات اور برادری کے امتیاز کے بغیر کی جائے

۳۔ دور جدید کے جدید ہتھیاروں مثلاً اسٹرائیک، مظاہرے، جلسے جلوس، دھرنا، پہیہ جام کرنا وغیرہ کو ان کی قیاحاتوں سے بچنے ہونے منکرات کے مٹانے اور نیکی اور بھلائی کی ترویج میں استعمال کیا جائے جبکہ دوسرے لوگ محض اپنے معاشی مفادات کے لئے یہ ہتھیار استعمال کرتے ہیں ۴۔ ملک کی اکثریت سے اگر کوئی مطالبہ کرنا ہے تو یہ مطالبہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو ایک اقلیتی گروہ نہیں بلکہ ایک صاحب عقیدہ نظریاتی گروہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور ایسی عدالتیں ہمارے لئے قائم کی جائیں جن میں مسلمانوں کے آپسی سارے مسائل اور مقدمات کا فیصلہ شریعت اسلامی کی روشنی میں کیا جائے۔ اور ان کے فیصلوں کے نفاذ کی ذمہ داری حکومت قبول کرے۔ اوقاف کا پورا نظم و انصراف مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو عصری اور دینی دونوں تعلیم کا نظم بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ مختصر یہ کہ اس طرح کا پورا سسٹم چلانے کے لئے ایک

باڈی بنائی جائے جس کے ممبران اور ذمہ دار مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب ہوں اور یہ انتخاب بھی الیکشن کمیشن کے ذریعہ کرایا جائے اور مسلمانوں کے ان منتخب نمائندوں کی حیثیت ایم۔ پی کے برابر ہو۔ ملک کی اکثریت کو یہ سمجھایا جائے کہ اس میں نہ ملک کا نقصان ہے نہ ملک کے کسی طبقہ کا نقصان ہے اور فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان ملت کے اندر زیادہ سے زیادہ اطمینان و سکون پیدا ہوگا اور وہ اس طرح ملک کے لئے زیادہ مفید ہو سکیں گے۔

ازالہ شبہات

اس مقام پر چند شبہات کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

۱۔ مودودہ سیاسی حکمت عملی کو ترک کرنے کی جو بات ہم نے کہی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم الیکشن کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ الیکشن میں شریک ہوا جاسکتا ہے۔ بلکہ بعض وقت ضروری ہوگا۔ بشرطیکہ کوئی شرعی تباہت نہ ہو۔ اس وقت کے الیکشن میں تباہت یہ ہے کہ یہاں کئی ایک باطل اور فاسد نظریات و عقائد کی جنگ ہے۔ الیکشن میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ ایک باطل نظریہ کے مقابلہ میں دوسرے باطل نظریہ کی ہم تائید کرتے ہیں۔ ایک فاسد اور مشرکانہ نظام کی جگہ دوسرے فاسد اور مشرکانہ نظام کے قیام کی جدوجہد میں ہم شریک ہو رہے ہیں۔ غور فرمائیے اگر دو بت رکھے ہوں اور دونوں کے پروہت دعویٰ کریں کہ ہمارا بت قابل پرستش ہے۔ اور ہر ایک عوام کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرے اور آخری فیصلہ کے لئے ووٹنگ ہو تو کیا اس ووٹنگ میں کسی مسلمان کا شریک ہونا جائز ہو سکتا ہے، ہاں اگر ایک طرف باطل نظریہ اور فاسد نظام ہو اور دوسری

طرف عقیدہ توحید اور نظام حق ہو تو اس وقت ووٹنگ میں شرکت ایک مسلمان کافر ضہوگا اور وہ نظام حق کے حق میں ووٹ ڈالے لیکن ایک ناحق کی جگہ دوسرے ناحق کو ثابت اور قائم کرنے کے لئے کوئی مسلمان کیسے کھڑا ہو سکتا ہے۔

الذین آمنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت (النساء)

ایمان لانے والے اللہ کے راستہ میں لڑتے ہیں اور کفر کرنے والے طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔

۲ لوگ کہیں گے کہ اس طرح تو ہم ملک میں یکا و تنہا ہو کر میرا اعتبار سے پیچھے ہو جائیں گے۔ میں پوچھتا ہوں آپ نے اپنے آپ کو پچھلی لائن میں کھڑا ہی کر لیا ہے سوچیے موجودہ جمہوری سسٹم میں کیا آپ بھی اکثریت میں آ سکتے ہیں۔ الایہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے کوئی راستہ نکال دے۔ اگر آپ اکثریت میں نہیں آ سکتے تو آپ آگے کیسے آئیں گے۔ آپ کا دس فیصد آتا بھی اس وقت محال نظر آتا ہے تو آپ کی بات کیسے چلے گی۔ آپ کا وزن کیسے محسوس کیا جائے گا۔ آپ آگے کیسے آئیں گے۔ الایہ کہ سیاست میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کی جائے۔ ہم کہتے ہیں آگے آتا ہے تو اس سسٹم کو ہٹانے کی کوشش کیجیے۔ ورنہ پس ماندگی کے گڑھے سے نہیں نکل سکتے ہیں۔

۳ کہا جاتا ہے کہ ووٹ ایک امانت ہے اور ووٹ دینا ہمارا قانونی حق ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے مگر یہ بھی تو سوچیے اس امانت کا اہل کون ہے یہ امانت اہل کفر کے حوالہ کی جا سکتی ہے۔ یا ایسے لوگوں کے حوالہ کی جا سکتی ہے جو اپنے دعویٰ ایمان کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کی سند کے بغیر قانون سازی کرتے ہیں اور اس کے رسول کی تعلیمات کو

”قانونی جواز“ سے کیا مطلب ہے۔ کیا شرعی جواز کے مقابلہ میں قانونی جواز کی بات کہی جا سکتی ہے۔ جس قانون کی بات آپ کہہ رہے ہیں اس قانون کی شریعت میں کیا حیثیت ہے۔ پھر کہا گیا کہ مولانا عاقل صاحب کو فتویٰ دینے کا حق نہیں ہے۔

فی الحال یہاں نہ تو ہم اصل مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں اور نہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولانا عاقل صاحب کی بات صحیح ہے یا غلط۔ اگر ضرورت پڑے گی تو ان دونوں پہلوؤں پر کسی وقت گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کسی شرعی مسئلہ پر شرعی انداز سے بحث اور گفتگو ہونی چاہیے۔ مولانا عاقل صاحب سے پوچھنا چاہیے تھا کہ حرام کہنے کی علت کیا ہے۔ پھر اس کے بعد بحث کی جاتی کہ ان کی بتائی ہوئی علت صحیح ہے یا غلط ہے اور اس علت کی بنیاد پر کوئی حکم لگایا گیا حیثیت رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ وضو اور غسل وغیرہ چند مسائل میں علماء فقہی طرز پر بحث اختیار کرتے ہیں۔ بقیہ اجتماعی مسائل میں عام لوگوں کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ جواب طلب سوال صرف ایک ہے وہ یہ کہ کسی قانون ساز ادارہ میں کتاب و سنت، قیاس اور اجماع کو نظر انداز کر کے قانون سازی کے لئے کسی شخص کو شرعاً متعین کیا جا سکتا ہے اس جواب کے بعد معلوم ہوگا کہ کس کو ووٹ دینا حرام اور کس کو حلال ہے